ہوگا۔ سر کے بال کھچڑی ہورے ہیں اور کلمہ وسے یاد نہ ہوگا۔"

"بھئی قسم اللہ پاک کی وسے کلمہ نئیں آتا۔ میاں میں تو بالکل ٹھیک کلمہ پڑھوں اور وہ ہر مرتبہ ٹوک کے وسے غلط کر دے۔"

"حد ہے یار۔" کالے خاں بولا۔

کالے خاں کی تائید حاصل ہوئی تو رفیا نے اور ہاتھ پیر پھیلائے۔ "میرے تو جی میں آئی کہ کہہ دوں کہ وکیل صاب پہلے خود کلمہ سیکھ لو۔"

علن رفیا کا فقرہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "پر مجھے تو ہنسی نمبردار پہ آوے ہے۔ وہ بھی کلمہ سکھاتا پھرتا ہے۔"

کالے خاں نے فوراً اعتراض کیا۔ "ہنسنے کی کیا بات ہے بے۔ کلمہ ہی تو وہ سکھلاوے ہیں۔"

"لو جی ہنسنے کی بات ہی نئیں اے۔" علن تاؤ میں آکر بولا۔ "اماں محلہ بھر کا تو وہ محصول ہضم کیے بیٹھا ہے۔ قسم کلمے محمد کی ڈکار نئیں لیتا سالا۔ فر سود پہ روپیہ چلاوے ہے۔ خود سود کھاوے ہے۔ دوسروں کو کلمہ"

شیرو پھر چونکا اور علن کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "علن میری بیڑیوں کا حساب کتنا ہوا؟"

"بڑا حساب کا چوکھا بن رہا ہے۔" علن چمک کر بولا۔ "انٹی سے پیسہ نکلتا نئیں۔ حساب پوچھے ہے۔"

"تو حساب تو بتا۔"

"بتادوں گا پہلی کو۔ ابھی کیا تو دے رہا ہے۔"

"نئیں بے حساب بیباق کر لے۔ کل میں جارہا ہوں۔"

"کہاں جا رہا ہے بے؟ لام پہ جائے گا؟"

رفیا نے فوراً بات کاٹ دی۔ "لام پہ جاوے گا بھڑوا۔ یاں سے ڈر کے جارہا ہوگا۔"

علن نے پھر اصرار سے پوچھا۔ "کہاں جارہا ہے بے؟"

"دلی۔"

"دلی؟"

"ہاں دلی۔ دلی۔" شیرو نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

کالے خاں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ رفیا نے کئی مرتبہ بولنے کی ہمت کی لیکن اسے کوئی بات بن ہی نہ پڑی۔ آخر پھر علن ہی بولا۔

''کیوں جارا ہے بے؟''

''تو پان بیڑی بیچ۔ تجھے اس سے کیا مطلب۔'' اور یہ کہہ کے شیر واٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے وہ پھر بولا۔ ''میرا حساب دیکھ رکھیو۔ صبح آؤں گا میں۔'' اور یہ کہہ کے شیر وا اپنی لاٹھی پٹخا تا گھر کو چل دیا۔

کالے خاں کا منہ اسی طرح کھلا ہوا تھا۔ رفیا پر سکتہ کی کیفیت طاری تھی۔ علن نے خواہ مخواہ پانوں پر پانی چھڑکنا شروع کر دیا تھا۔

دلی

۱۷ اگست

بڑی مشکل سے پاؤں ٹکانے کی جگہ ملی ہے اسے مکان کہنا تو کچھ مبالغہ ہی ہوگا پاؤں ٹکانے کی جگہ ہی کہنا چاہیے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی میں رہنے کو جگہ مل جاتی تھی۔ کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ اب یہ زمانہ ہے کہ یہاں نوکری مل جاتی ہے مکان نہیں ملتا۔ میں تو اس پر حیران ہوں کہ یہاں سے روز مسلمانوں کے قافلے پاکستان روانہ ہوتے ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ کسی مسلمان محلہ میں کوئی مکان خالی نظر آ جائے۔ مکین تو پاکستان چلے جاتے ہیں مگر مکان کہاں جاتے ہیں۔ روز میلہ ڈھلتا ہے۔ جسے دیکھو ٹانڈا بانڈا اسبھالے چلا جا رہا ہے۔ پوچھو کہ حضرت کدھر کو۔ جواب ملے گا۔ ''میاں دلی میں رہنے کا دھرم نہیں رہا۔ پاکستان جاتے ہیں'' اسٹیشن پر جا کر دیکھئے تو عجب منظر نظر آئے گا۔ یوں نظر آئے گا کہ ساری دلی اسٹیشن پر ٹوٹ پڑی ہے۔ مگر محلوں میں جا کر دیکھئے تو مکان بدستور گھرے ہوئے ہیں یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے یا تو دلی والے ہی سلیقہ سے دلی خالی کر رہے ہیں یا پھر ہمیں مکان حاصل کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ بہر حال ہم یہیں ہیں اور دلی کے مسلمانوں کو پاکستان جانا ہے۔ کبھی تو ٹھکانے کا مکان ملے گا ہی۔

۲۰ اگست

اب تک تو میں مکان کی فکر میں سرگردان رہا تھا۔ مدرسہ کی حالت پر نظر ڈالنے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ خدا خدا کر کے اب اس طرف سے سکون ہوا ہے سو مدرسہ کے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا ہے دراصل میں کچھ ضرورت سے زیادہ رجائیت پسند ہو گیا تھا مدرسہ اسلامیہ والوں کے دعوے ہی دعوے تھے اس میں اور دوسری درس گاہوں میں مجھے کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا۔ یہ ضرور ہے کہ مدرسہ والوں نے اپنے طرز تعلیم میں ایک نیا پن پیدا کرنے کی بری بھلی کوشش کی ہے مگر یہ نیا پن ایسا نہیں ہے کہ اس کی بنا پر ہندی مسلمانوں کی نئی پود میں کسی زبردست ذہنی انقلاب کی توقع کی جا سکے۔ رہا طلبا کا معاملہ تو ان میں بھی مجھے کوئی خاص چمک نظر نہیں آتی۔ دلی کے ہم نے بہت ذکر اذکار سنے تھے۔ لیکن اب چکھا تو پتہ چلا کہ اس اونچی دوکان کا پکوان بھی خاصا پھیکا ہے۔ علی گڑھ کے

لڑکوں اور دلی کے نوجوانوں میں مجھے اس کے سوا اور کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ موخرالذکر اردو اچھی بولتے ہیں۔ یہ امتیازی صفت ہے کوئی وصف تو نہیں ہے۔

بہرحال میں تو یہاں آ ہی پڑا ہوں۔ علی گڑھ کے تالوں کے کاروبار سے یہ صورت بہرصورت بہتر ہے۔ وہاں تو کوئی بات سننے کا بھی روادار نہیں تھا اور کیوں ہوتا وہاں کی فضا تو خالص نعروں کی فضا ہے۔ علی گڑھ کے یتیم الفکر طلبا کو سوچ بچار سے کیا واسطہ۔ یہاں میں نوجوانوں تک کم از کم اپنی بات تو پہنچا ہی سکتا ہوں۔

۲۲ اگست

دلی خوب شہر ہو یا نہ ہو عجیب شہر ضرور ہے۔ معلوم نہیں لوگ باگ کیوں اس شہر کی تعریفوں کے پل باندھتے تھے۔ مجھے تو یہاں وحشت ہوتی ہے۔ یہاں کے در و دیوار مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ میں اس شہر میں نیا نیا ہوں یا پھر واقعی یہاں کی فضا وحشت خیز ہے یہاں کے بازاروں میں عجیب ہنگامہ نظر آتا ہے۔ دلی کے شائقین شاید اسی ہنگامے کو چہل پہل بتایا کرتے تھے۔ مگر مجھے تو یہ سراسیمگی کا طوفان نظر آتا ہے۔ یہاں کے بازاروں میں چلتے ہوئے میں جس صورت پر نظر ڈالتا ہوں اس پر یا تو وحشت برستی نظر آتی ہے یا ڈراؤنی کیفیت دکھائی دیتی ہے ایک عجیب بات یہ ہے کہ یہاں کی راتیں مجھے بڑی ڈراؤنی معلوم دیتی ہیں۔ علی گڑھ کی تخصیص نہیں' میرا ہر جگہ یہ طور رہا کہ رات رات بھر سڑکوں پر گھومتا تھا اور علی گڑھ کی تو خیر بات ہی نرالی تھی۔ نہ جانے وہاں میری کتنی راتیں سڑکوں پر گھومتے کٹی ہیں۔ علی گڑھ کے پنواڑی خاصے زندہ دل تھے۔ رات گئے تک دوکانیں کھولے رکھتے تھے اور پھر وہاں کا اسٹیشن تھا جو دن سے زیادہ رات کو آباد نظر آتا تھا۔ مگر یہ دلی عجب شہر ہے۔ شام سے شہر میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ سڑکیں ہو حق کرتی ہیں۔ فضا سائیں سائیں کرتی ہے۔ اکثر یوں ہوا ہے کہ میں چلتے چلتے خود اپنے قدموں کی چاپ پر چونکا ہوں۔ ایک چیز جو مجھے یہاں بہت چونکاتی ہے۔ وہ کتوں کا رونا ہے۔ کتے راتوں کو ہر جگہ روتے ہیں۔ علی گڑھ میں بھی روتے تھے' حسن پور میں بھی روتے تھے۔ مگر دلی کے کتے کچھ اتنی دردانگیزی سے روتے ہیں کہ دل خواہ مخواہ دھڑکنے لگتا ہے۔ کئی مرتبہ میرے ذہن میں ایک عجیب وغریب سوال پیدا ہوا کہ دلی کے کتوں کی آواز میں اتنا سوز کیوں ہے اور راتوں کو ان پر گیر معمولی حد تک رقت کیوں طاری ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑا بے ڈھنگا سوال ہے اور مجھ جیسے بے ڈھنگے آدمی کا الٹا دماغ ہی ایسے سوال کو جنم دے سکتا ہے۔

۲۳ اگست

آج شام کو میں بہت دیر تک چاندنی چوک میں گھومتا رہا۔ اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھا۔ ایک سے ایک اچھی صورت نظر آئی۔

دلی کا پانی جو کسی زمانے میں بہہ کر ملتان چلا گیا تھا شاید اب بہہ کر دلی واپس آ رہا ہے۔ میرے لیے تو خیر یہ شہر نیا ہے۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دلی میں رنگ و نور کی ایسی فراوانی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ چاندنی چوک واقعی چاندنی چوک بن گیا ہے۔ چاندسی صورتوں کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ ہر ہر قدم پر ایمان و آگہی کی بازی لگانے کو جی چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ لاہور تو اب چونڑی ہوئی امبیا بن کر رہ گیا ہوگا۔ پاکستان اچھا بنا لاہور کا پانی دلی کے بازاروں میں بہا بہا پھرتا ہے۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود دلی ویران سی نظر آتی ہے۔ چاندنی چوک کف گھروش بنا ہوا ہے۔ پھول تازہ بھی ہیں خوش رنگ بھی ہیں۔ پھر یہاں کی فضا کو یں اتنی ویران نظر آتی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کہیں یہ اپنے ہی دل کی خانہ ویرانی تو نہیں ہے۔

۲۴ اگست

رات بہت دیر سے نیند آئی تھی پھر بھی منہ اندھیرے آنکھ کھل گئی۔ کلی کی' منہ پر دو چھپاکے مارے اور گھر سے نکل پڑا۔ تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے میں عجب لطف آتا ہے۔ مگر یہ دلی عجب بے لطف جگہ ہے۔ پر لطف چیزوں میں بھی لطف نہیں آتا۔ دلی کی صبح عجب ملگجی سی ہوتی ہے۔ گھومتا گھامتا جمنا گھاٹ کی طرف نکل گیا۔ وہاں جا کر بھی طبیعت ہری نہ ہوئی۔ جمنا بہتی تو کیا ہے بس اونگھتی ہے۔ ایسے نرم رو پانی کو دریا کہنا مجھے تو کچھ زیادتی سی لگتی ہے۔ میں جنوبی ہند کے دریا دیکھے ہیں۔ کس زور شور سے بہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دکن کی ساری چٹانوں کو بہا کر لے جائیں گے۔ دراصل مجھے نرم گرم اور سست رو چیزوں کو دیکھ کر کچھ خفقان سا ہوتا ہے۔ میں تو ہنگامہ اور حرکت چاہتا ہوں۔ سبطین کی جس بات پر مجھے غصہ آتا ہے وہ اس کے مزاج کا دھیما پن ہے۔ وہ سوائے خواب دیکھنے کے اور کچھ جانتا ہی نہیں۔ مگر خواب بھی ادھ مرے ہوتے ہیں۔ اس سے اچھا تو اس کا ملازم رفیا ہے اور کچھ نہ سہی اس کی آواز میں گرمی تو ضرور ہے۔ سبطین تو نرا بجھا ہوا انگارہ ہے۔ میں نے اسے ٹھیک ہی مشورہ دیا ہے کہ کسی لڑکی سے محبت کرو۔ بس وہ محبت ہی کر سکتا ہے اور وہ بھی لڑکی سے' عورت سے نہیں۔ عورت سے لڑکے نہیں مرد محبت کرتے ہیں۔ معلوم نہیں سبطین کے گھر کے سامنے والی کا کیا حال احوال ہے۔ سبطین اسے عورت بتاتا تھا۔ اس کی سوجھ بوجھ پہ مجھے اعتبار تو ہے نہیں مگر وہ غالباً عورت ہی ہوگی۔ اس کا طور یہی بتاتا تھا۔ جی میں آتا ہے کہ ایک روز کے لیے حسن پور جاؤں اور اسے ایک نظر دیکھ لوں مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی خوبصورت نہیں ہوگی مگر اس میں ایک ٹھسا ضرور ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ پاکستان نہ چلی گئی ہو۔ آج کل تو جس کے متعلق سوچئے وہ خندق کے پار ہی نظر آتا ہے۔ لوگ خاصے ملتے ہیں' علیک سلیک ہوتی ہے' موسم کے حال پہ گفتگو ہوتی ہے۔ دوسرے دن ان کی خیر و عافیت پوچھئے تو پتہ چلتا

ہے کہ وہ تو پاکستان گئے۔تو کیا عجب ہے کہ وہ بھی پاکستان چل دی ہو۔مگر مارو گولی۔میں اس کے بارے میں سوچ کیوں رہا ہوں۔ مجھے اس سے کونسی محبت کرنی رہی ہے۔رہا یہ سوال کہ وہ عورت ہے یا لڑکی تو اس کا جواب خود بخود مل جائے گا۔اگر سبطین کا اس سے عشق ہو گیا تو وہ لڑکی ہے ورنہ عورت۔

۱۲۶ اگست

میں اس شہر کو جتنا دیکھتا ہوں اتنا ہی زیادہ مجھے یہ عجیب نظر آتا ہے آج مدرسہ کی چھٹی تھی میں حوض قاضی کی طرف نکل گیا۔وہاں کی گلیوں میں بہت دیر تک بے مقصد گھومتا رہا۔پھر چاڈری ہوتا ہوا کوچہ چیلان میں نکل گیا۔کوچہ چیلان کوچہ ہے یا شیطان کی آنت ہے۔گلیاں شوشوں کی طرح نکلتی ہی چلی گئی ہیں۔خیر مجھے تو گھومنے سے مطلب تھا۔مسلمان محلوں کا عجب عالم ہے جتنے مکان ہیں اتنی کبوتروں کی چھتریاں ہیں اگر اوپر سے کوئی دلی کو دیکھے تو ساری فضا میں مسجد کے میناروں اور کبوتروں کی چھتریوں کا ایک جال تنا ہوا نظر آئے گا۔جامع مسجد کے سامنے جسے دیکھو مٹھی میں کبوتر دبائے پھرتا ہے۔جس کی مٹھی میں کبوتر نہیں اس کے ہاتھ میں لالوں کا پنجرا ہوگا۔مسلمانوں کا یہ حال دیکھ کر طبیعت بہت منغض ہوئی۔سوچا تھا کہ چاندنی چوک چلو۔طبیعت اور سی ہو جائے گی۔ابھی یہاں قدم ہی رکھا تھا کہ ایک بزرگ ایک شہدے سے مصروف گفتگو نظر آئے۔میں ٹھٹک گیا۔

کہہ رہے تھے۔"اماں خلیفہ جی! یہ بئے کا بچہ کیا لیے پھرتے ہو؟"

شہدے کی مٹھی میں ایک سفید کبوتر دبا تھا۔اس فقرے کو سن کر گرم ہوا بولا۔"خان صاحب۔تم نے بئے کے بچے پالے ہیں۔ کبھیوں قبوتر نئیں دیکھا۔"

خاں صاحب ٹھنڈے پڑ گئے۔کہنے لگے۔"تو میں نے کہا پہلوان دکھاؤنا۔"

شہدا اور چڑھ گیا۔"اماں تمہارے مطلب کے بھی میں نے رکھ چھوڑے ہیں۔اپنا وے لمڈا ہے نئیں کنجی آنکھوں والا دس کے چوبارے پہ کسیوں دن آ جانا۔دے دوں گا کوئی سستے داموں کا قبوتر پر اس وقت تو قیمتی قبوتر ہے اپنے پاس۔"

خاں صاحب گرما گئے۔"اماں خلیفہ صورت دیکھ کے بات کیا کرو۔میاں ہم نے تو پیسے کو ہمیشہ ہاتھ کا میل سمجھا۔سوئیوں والے محلہ میں دو کانوں کی لین کی لین تھی۔سب کبوتروں اور شطرنج پہ ہی بھینٹ چڑھائی۔وہ چھنگا پہلوان ہے ناوس کے جو گئے پہ دل آ گیا۔وس نے کیہا کہ اپنی کالے آموں والی بغیا دے دو۔ہم بھی ہوا کے گھوڑے پہ سوار تھے۔قسم قبلہ شریف کی فوراً قبالہ لے لیا۔تو میاں ایجانب سے ذریوں سنبھل کے بات کیا کرو۔لاؤ دکھلاؤ دیکھیں کہ کس برتے پہ اینٹھ رئے اؤ۔"

خلیفہ خاں صاحب کے ہاتھ میں کبوتر تھماتے ہوئے بولا۔ ''خاں صاحب لوٹن ہے لوٹن ذریوں وسے چھوڑو فر دیکھو کمال۔ قلابازیں کھاتا ہوا آسمان پہ جاوے گا۔''

خان صاحب نے اس کی بات فوراً کاٹ دی۔ ''اماں ہمیں نٹ کا تماشہ تھوڑائی کرنا ہے قبوتر اڑانا ہے۔''

خلیفہ ہار ماننے والا کب تھا۔ بولا۔ ''اڑان کی تو یہ سن لو کہ فجر کو دانہ کھلا کے ارادیجو' چوبیسوں گھنٹے اڑے گا اور رات میں بس کے دوسرے دن فجر کو چھتری پہ گرے گا۔ خانصاحب وس کی چونچ دیکھو چونچ۔''

خاں صاحب نے چونچ دیکھی۔ پھر پنجوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس کے بازوؤں کو پھیلا کر دیکھا اور بولے۔ ''ہاں تو پہلوان بتادو ٹھیک ٹھیک۔''

خلیفہ تن گیا۔ ''خانصاحب دلی میں کوئی اس کا جوڑ نکال کے دکھاوے تو وس کی ٹانگوں کے نیچے سے نکل جاؤں گا۔ اماں اتفاق ہے۔ لکھنو میں ایک نواب صاب ہیں۔ ہمارے سلے سے ون کی تو تکار ہے۔ پچھلے پندرواڑے دے نکھلو گیا تھا ونھوں نے وسے یہ قبوتر دے دیا''

معلوم نہیں آگے اور کیا گفتگو سے مجھے ایسی کوفت ہوئی کہ فوراً ہی میں آگے بڑھ گیا۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ وہی دلی ہے جسے شاہجہان نے آباد کیا تھا۔

۲۷ اگست

کچھ بھلا سا نام تھا اس محلہ کا۔ دلی کے محلوں کے نام بھی تو کچھ عجیب سے ہیں۔ بہر حال وہ کوئی محلہ تھا۔ ایک مکان پر میں نے ایک بورڈ لٹکا دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔ ''یہاں بارات کے لیے گھوڑے کرائے پر ملتے ہیں۔''

یہ بورڈ پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور تعجب بھی ہوا۔ ہنسی اس پر آئی کہ دلی والے عمر میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور گھوڑے پہ چڑھ لیتے ہیں اور رنڈوؤں کو دوسری مرتبہ بھی یہ شرف حاصل ہو جاتا ہوگا۔ تعجب اس پر ہوا کہ دلی سے گھوڑے ابھی تک ناپید نہیں ہوئے ہیں اور باراتوں کے لیے ہی سہی گھوڑے مل ضرور جاتے ہیں۔

وہ سوال جو کل میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا آج پھر کروٹ لے رہا ہے۔ کیا یہ وہی دلی ہے جسے شاہجہان نے آباد کیا تھا اور کیا یہ وہی دلی ہے جس کی سڑکیں آج سے سو سال پہلے بخت خاں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھی تھیں۔ شاہجہان اور اورنگ زیب تو دنیا سے اٹھ ہی گئے۔ لیکن کیا کوئی بخت خاں بھی اب باقی نہیں ہے؟

۲۸ اگست

آج لال قلعہ جانے کا ارادہ کیا تھا۔ چار بجے مدرسہ سے چھوٹا اور سیدھا قلعہ کی طرف چلا۔ قلعہ یہاں سے خاصے فاصلہ پر ہے اور پھر یوں بھی میں پیدل چلنے کا قایل ہوں۔ پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ قلعہ کا دروازہ بند ہوگیا۔ میں وہاں سے ایڈورڈ پارک پہنچا اور سبزے پر لیٹ گیا۔ ایک چمپی والا میری طرف بڑھا۔ میں نے اسے پھٹکار دیا۔ یہ چمپی بھی عجب مذاق ہے۔ آدمی اچھا خاصا گڈا سا لگنے لگتا ہے۔

جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ دور سے کسی مندر کے گھنٹے کی آواز رک رک کر بڑے باوقار انداز میں آ رہی تھی۔ جامع مسجد سے اذان کی آواز کچھ یوں بلند ہو رہی تھی جیسے کوئی نوحہ پڑھا جا رہا ہو۔ قلعہ کی دیواریں چپ چاپ کھڑی تھیں اور اس کی برجیوں اور کنگروں پر اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں لیٹے لیٹے وقت کی نیرنگی پر غور کرنے لگا۔ زندگی کے کیسے کیسے پرشوکت مظاہرے اس کے ایک اشارے پر افسانہ وافسوں بن کر رہ جاتے ہیں۔ شاہجہان کے وقت میں بھلا کس کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی کہ قلعہ کی فضا کی یہ ساری گہما گہمی یہ سارا ہنگامہ ایک روز موت کے سناٹے میں غرق ہو جائے گا اور خود لال قلعہ ایک خاموش مرثیے کی شکل اختیار کر لے گا۔ آج سے سو سال پہلے اس برعظیم کے گوشہ گوشہ سے یکا یک ایک شور اٹھا اور اس شور کی دھمک سے اس قلعہ کے در و دیوار ہل گئے۔ پھر یہ شور تھم گیا اور ایسا تھما کہ لال قلعہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا' گنگ ہو گیا۔

میں سوچنے لگا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ خاموشی ایک مرتبہ پھر ٹوٹے۔ کوئی کالے خاں ایک مرتبہ پھر اس قلعہ کی فصیل پر کھڑے ہو کر گولے پھینکے اور جمنا کے خاموش پانی میں شور پیدا کرے۔ مگر اس شہر میں اب کالے خاں اور بخت خاں کاہے کو پیدا ہوں گے یہاں کے خان اور خلیفہ تو کبوتر اڑانے کو زندگی کا سب سے بڑا مظاہرہ سمجھتے ہیں۔

شام کے جھٹپٹے میں یوں بھی فضا میں ایک سوز ایک درد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور آس پاس کوئی تاریخی کھنڈر ہو تو اس سوز میں دوگنا چوگنا اضافہ ہو جاتا ہے اس وقت لال قلعہ کو دیکھ کر مجھ پر وہ کیفیت گزری۔ جو چاند کو گہناتے دیکھ کر گزرتی ہے۔ چاند گہن میں تپش سے زیادہ سوز کی کیفیت ہوتی ہے وہ ایک کربناک کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن اس میں آواز نہیں ہوتی۔ ارتعاش نہیں ہوتا۔ اس وقت میری آنکھوں میں جھٹپٹے میں ڈوبے ہوئے وہ لال قلعہ کے در و دیوار پھر رہے ہیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ چاند آسمان پر خاموشی سے کرب کے عالم میں گہناتا چلا جا رہا ہے۔

۲۹ اگست

اب تو دلی کی فضا میں سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ راتوں کو گھومنے کا سلسلہ اب تقریباً ہو چلا ہے۔ سپاہی قدم قدم پر ٹوکتے ہیں۔ دن میں گھومنے کی اس لیے فرصت نہیں ملتی کہ مدرسہ میں سر جھکانا پڑتا ہے۔ آج چھٹی تھی۔ میں مہرولی کی طرف چل نکلا۔ معلوم نہیں کیوں آج مجھے دلی میں پہلی مرتبہ بس میں سوار ہونے کا خیال آیا مگر پھر میں اس خواہش پر غالب آ گیا۔ اپنی ٹانگوں میں ابھی دم ہے اور ٹانگوں میں دم ہوتے ہوئے بس اور ٹرام کی سواری کی تک میری سمجھ میں نہیں آتی۔

حضرت نظام الدین اولیا کے مزار سے آگے بڑھا تو ایک خستہ حال دروازہ نظر آیا اس پر لکھا تھا۔ ''مدفن غالب'' میرے جی میں آئی کہ ایک کوئلہ کا ٹکڑا اٹھاؤں اور اس کے نیچے لکھ دوں۔

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے

مگر پھر میں نے سوچا کہ کس رند شاہد باز کے لیے یہ تکلیف مول لیتے ہو۔ میں آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے میں سوچنے لگا کہ یہ غالب کے یہاں موت کی اتنی شدید خواہش جو ملتی ہے وہ اس کی انفرادی خواہش ہے یا کسی اجتماعی خواہش کی ترجمان ہے۔

حضرت نظام الدین اولیا کے مزار سے لے کر قطب مینار تک ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔ قدیم شکستہ عمارتوں کے سلسلے حد نظر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جا بجا شکستہ حال مقبرے اور کاہی آلود گنبد دکھائی دیتے ہیں۔ چپ چاپ اونگھتے ہوئے گدھوں نے ان مقبروں کی ویرانی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ویرانی دلی کے کس گوشے میں نہیں ہے ایک مہرولی پہ موقوف نہیں مجھے تو دلی کی پوری فضا میں موت کے سائے کانپتے نظر آتے ہیں۔

۳۰ اگست

دلی کی نہاری کا بہت شور سنا تھا۔ آج میں نے اسے بھی چکھ دیکھا۔ دو نوالے کھانے کے بعد کیفیت یہ ہوئی کہ زبان سن ہو گئی اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ دل والوں کی زندگی میں سے تیزی اور گرمی غائب ہو چکی ہے۔ اس کی کمی وہ اب یوں پوری کر رہے ہیں۔ اس شہر میں آ کر میں بری طرح مایوس ہوا ہوں۔ بھلا یہاں والوں سے کیا توقع کی جائے وہ غریب تو دو ہی کام جانتے ہیں۔ نہاری کھاتے ہیں اور کبوتر اڑاتے ہیں۔ بھلا ہوا کہ مثنوی زہر عشق یہاں نہیں لکھی گئی۔ ورنہ یہ لوگ تو کوٹھوں سے کود کود کر جانیں دے دیتے۔ خیر وہ زندہ تو اب بھی نہیں ہیں۔

یکم ستمبر

اگست ختم ہوا۔ وہ مہینہ جس نے برعظیم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا افتتاح کیا۔ آج ستمبر شروع ہوا ہے۔

آج صبح آنکھ کھلتے ہی ایک ایسا واقعہ دیکھا کہ سارا دن جی اداس رہا۔ میرے کمرے کے عین سامنے والے مکان میں کبوتر پلے ہوئے ہیں۔ صبح میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی تھی۔ آنکھ کھل گئی پھر بھی میں ذرا کروٹیں بدلتا رہا۔ سامنے والی چھت پر کبوتر دانہ چگ رہے تھے۔ ایک سفید کبوتر سب سے الگ منڈیر پر چپ چاپ اور افسردہ سا بیٹھا تھا۔ اتنے میں کوئی چیز تیر کی طرح اس پر جھپٹی اور اسے اٹھا کر لے گئی۔ یہ ہے تو بڑا معمولی سا واقعہ دلی کے کبوتر بازوں کے نہ معلوم کتنے کبوتر روز بیریوں کی نذر ہو جاتے ہیں مگر مجھ پر اس واقعہ کا دن بھر اثر رہا۔ اس کبوتر کی اداس صورت رہ رہ کر یاد آتی رہی۔

۲ ستمبر

آج ایک دہلوی بزرگ سے ملاقات ہوئی کہتے تھے کہ ستمبر کا مہینہ دلی کے لیے منحوس ہے۔ ۱۸۵۷ء میں بھی ستمبر ہی کے مہینہ میں دلی پر آفت آئی تھی۔ گویا دلی والے کبوتروں' لالوں اور پتنگوں کے ہی رسیا نہیں ہیں تو ہم پرستیوں میں بھی مبتلا ہیں۔ میں نے انہیں بے ساختہ جواب دیا کہ "دلی اب نہ وہ دلی ہے نہ یہاں کوئی بہادر شاہ ظفر بیٹھا ہے اب یہاں کونسی چیز تباہ ہونے کے لیے باقی ہے۔"

دہلوی بزرگ گرم ہو کر بولے۔ "اے جناب ہماری دلی کو آپ نے کیا سمجھا ہے اس میں اب بھی بہت کچھ ہے۔ مرا ہاتھی سوا لاکھ کا۔"

ان لوگوں سے کوئی کیا بات کرے۔ ہر بات پر کوئی ضرب المثل کہہ ڈالتے ہیں' کوئی محاورہ جڑ دیتے ہیں۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ دلی میں اب اگر غدر پڑے تو کبوتروں کی کابکوں اور لالوں کے پنجروں کے علاوہ اور کیا چیز تباہ ہوگی۔

۳ ستمبر

آج شام کو جب میں چتلی قبر سے گزر رہا تھا۔ ایک فقیر کو دیکھا۔ میلے کچیلے پھٹے کپڑے۔ لمبا تڑنگا۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ پاٹ دار آواز۔ پیمبرانہ انداز میں اعلان کرتا چلا جاتا تھا کہ "چاند گرہن پڑے گا۔ دان دو۔"

معلوم نہیں یہ فقیر کونسے چاند گرہن کا ذکر کرتا تھا۔ چاند گرہن تو پڑ رہا ہے۔ امرتسر سے کلکتہ تک مجھے تو گہن ہی گہن نظر آتا ہے۔ پاکستان کا پتہ نہیں ہے وہ اب میرے لیے دوسرا ملک ہے۔

۴ ستمبر

دلی کی فضا روز بروز مکدر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کچھ فضا خود مکدر ہے۔ کچھ افواہوں نے اسے مکدر کیا ہے۔ رات کو ٹہلنے کا دھرم اب

بالکل نہیں رہا۔ اب تو یہ کیفیت ہے کہ چراغ میں بتی پڑی ادھر ہم نے بستر سنبھالا۔ لیکن نیند رات گئے تک نہیں آتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ دلی کے کتوں نے دفعتاً رونا بند کر دیا ہے۔ فضا میں ایک سناٹا طاری رہتا ہے۔ لیکن یہ سناٹا تو کتے کے رونے کی آوازوں سے بھی زیادہ ڈراؤنا ہوتا ہے۔

بوجی نے تو کسی کے بارے میں تخصیص نہیں برتی تھی۔ سبھی محلہ والیوں کو بلاوا بھجوایا تھا۔ مگر گلشن نے واقعی تخصیص برتی۔ بہت سے گھروں کے بارے میں تو اس نے سرسری ٹالا۔ اور حمید ڈاکیہ کی بیوی بلو کی تو دہلیز کو بھی اس نے نہیں چھوا۔ ہاں نمبردارنی سے وہ خاص طور پر کہہ کر آئی کہ ''نمبردارنی صاب آج مجلس ہے۔ تم نہ آئیں تو بوجی بہت برا مانیں گی۔ اور سویرے سے آئیو'' فرد کوٹھے والی کے سلسلہ میں بھی اس نے اہتمام برتا تھا مگر اس میں دقت ہی کیا اٹھانی پڑی ہوگی۔ سامنے ہی تو اس کا مکان تھا۔ پھر گلشن کو یہ بھی پتہ تھا کہ وہ بڑی تک چڑھی ہے اگر خاص طور پر اس سے نہ کہا گیا تو وہ نہیں آئے گی بلکہ کئی ایک مرتبہ تو گلشن نے بوجی سے شکایت بھی کی تھی۔ ''اے بوجی یہ فرد کوٹھے والی تو ٹھسے میں مری جاوے ہے۔ مئی کا خصم منہ نئیں لگاتا اس پہ یہ حال ہے کہیں ہوتا کچھ تو یہ تو زمین پہ قدم نئیں رکھتی'' خیر یہ تو گلشن کا تکلف تھا ورنہ فرد زمین پر قدم تو اب بھی نہیں رکھتی تھی۔ فرد کوٹھے والی دراصل افسری فاطمہ تھی۔ قاعدے کی رو سے افسری کو بگڑ کر ابو بننا چاہیے تھا لیکن یا تو عرف کی کوئی قواعد ہوتی ہی نہیں یا پھر بوجی نے اس کی پابندی لازمی نہ سمجھی۔ انہوں نے افسری کو بے سوچے سمجھے فرد کہنا شروع کر دیا۔ چونکہ وہ اوپر کے مکان پر رہتی تھی اس لیے کوٹھے والی' کا ٹکڑا اس کے عرف کے ساتھ اسی طرح جوڑ دیا گیا جس طرح شاعروں کے تخلص کے ساتھ دہلوی' دریابادی' لدھیانوی قسم کی دمیں لگائی جاتی ہیں۔ بہرحال اس نام پر اعتراض کچھ بھی کئے جائیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس میں بندش کی چستی اور ایک قسم کی حرکت اور گرمی ضرور ہے بلکہ فرد' کا لفظ تو اچھا خاصا جوش کا شعر معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ عرف اتنا عام نہیں ہوا کہ لوگ اصل نام ہی کو بھول جاتے۔ آخر بوجی اسی بیٹے کی تو ماں تھیں جس کی اسلامی عوامی انقلابی تحریک ہزار کوششوں کے باوجود قبول عام حاصل نہ کر سکی۔ لیکن دراصل عرف کی کامیابی اور ناکامی میں اصل ناک کا بھی بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ جو نام' نام والے کی شخصیت سے میل نہیں کھاتے انہیں تو عرف اس بری طرح فنا کرتے ہیں کہ ان کا نام ونشان بھی پھر نہیں ملتا۔ بلو کی مثال موجود ہے' اور تو اور محلہ بڑی بوڑھیوں تک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بلو کا اصل نام کیا ہے نمبردارنی تو ایک ایک کی سات پشتوں تک سے واقف تھیں لیکن بلو کا اصل نام تو وہ بھی کبھی نہیں بتا سکیں۔ لیکن ایسے نام بھی ہوتے ہیں جن کا نام والے سے اتنا گہرا تعلق ہوتا ہے کہ وہ زیر زبر تک کی تبدیلی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایسے ناموں پر عرف بھلا کب غلبہ پا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رفیا جس نے ہر محلے والے کے نام کو بگاڑا تھا فیاض خاں کے نام میں کبھی ایک نقطہ کی بھی تبدیلی نہ کر سکا۔ لجبی

شخصیت والوں کا ذکر نہیں ہے۔ ان کا نام روز نام بدلیے روز ایک نیا عرف رکھیے' کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسے لوگ ہر نام ہر عرف اور ہر لقب کو بے چون و چرا قبول کر لیتے ہیں۔ فضل حق وکیل کا نام اگر ابوالحسن یا محمد عمر یا رضا علی ہوتا تو اس سے کیا فرق پڑتا۔ لیکن نوابن تو نوابن ہی تھی حالانکہ دنیا کو معلوم تھا کہ اس کے مرحوم شوہر نہ تو خود نواب تھے نہ کسی نواب کے دربان تھے۔ خیر یہاں تک تو ہم ایک اصول قائم کر سکتے ہیں کہ عرف وہ مقبول ہوتا ہے جو شخصیت کی پورے طور پر نمائندگی کرتا ہے۔ مگر عرف ظہور میں کیسے آتے ہیں اس کے متعلق کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ افسری تو اپنے نام کی بنا پر فروبنی تھی۔ مگر بلو اور نوابن کسی بنا پر بلو اور نوابن بنیں اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ پھر نمبردارنی تو نمبردار کی اہلیہ ہونے کی وجہ سے نمبردارنی کہلائیں لیکن بوجی ڈپٹن کیوں نہیں کہلائیں حالانکہ ڈپٹی صاحب کا بڑا نام تھا اگر ان کی آل اولاد بہت سی ہوتی اور محلہ میں کیڑے مکوڑوں کی طرح بھی بھی پھرتی تو مان لیا جاتا کہ چلئے اکثریت نے بوجی کہنا شروع کر دیا وہ بوجی بن گئیں۔ حالانکہ اسی بیٹے نے جب اسلامی عوامی انقلابی تحریک شروع کی تو کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا خیر ذکر تو افسری کا تھا۔ دراصل افسری کی شخصیت کچھ اس قسم کی تھی کہ اس کا اظہار پورے طور پر نہ تو افسری فاطمہ کے نام کے ذریعہ ہوتا تھا اور نہ فرد کو ٹھے والی' کے عرف کی وساطت سے ہوتا تھا بلکہ دونوں کو ملایئے تب کچھ پتہ چلتا تھا کہ یہ کس قسم کی عورت ہوگی۔ غالباً یہاں یہ جتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ نام اور عرف دونوں اس کی غمازی کر رہے ہیں کہ وہ لڑکی نہیں بلکہ عورت تھی یہ الگ بات ہے کہ اس کی عمر ایسی زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی ستائیس اٹھائیس سال کے پیٹے میں ہوگی۔ البتہ اس میں جو ایک قسم کی تمکنت اور وقار تھا اس کا پتہ اس کے عرف سے نہیں بلکہ نام سے چلتا تھا فیاض خاں کا قیاس ایک حد تک درست ہی تھی۔ وہ واقعی ایسی زیادہ حسین و جمیل نہیں تھی لیکن وہ سج دھج کی عورت ضرور تھی۔ بدن چھریرا تو نہیں تھا لیکن ایسا بھاری بھی نہیں تھا۔ چوڑی ہڈی' لمبا قد' کھلتا ہوا رنگ سینہ بھرا بھرا۔ کمر بے شک پتلی نہیں تھی لیکن کمر سے لے کر گردن تک کے خطوط بڑے ترشے ہوئے نظر آتے تھے۔ آنکھیں شربتی تھیں۔ شربتی آنکھوں میں وہ سیاہ آنکھوں والی چمک دمک تو نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی ان میں ایک سنجیدہ قسم کا ٹھہراؤ ضرور ہوتا ہے اور افسری کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں اس کیفیت کی حامل تھیں لیکن اس کی شخصیت میں سب سے پر اثر اور جاذب توجہ تو اس کے چہرے کی وہ کیفیت تھی جو یہ کہتی نظر آتی تھی کہ یہ ارد گرد کی ساری چیزیں ہیچ ہیں۔ اس جسم کو دیکھو جو جسم بھی ہے اور جسموں کا مرکز ثقل بھی ہے جسم بھی دراصل مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض جسم تو سرے سے جسم ہی نہیں ہوتے دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ ایسی عورتیں بھی ہوتیں ہیں جو جنس نہیں ہوئیں محض صنف ہوتی ہیں اور بعض جسم' جسم بھی ہوتے ہیں اور جسم سے بڑھ کر بھی کچھ ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر بس یہ جی چاہتا ہے کہ سجدے میں جھک جایئے یا آرتی اتارنے لگئے۔ ان سب سے الگ ایک جسم ایسا بھی ہوتا ہے جسے دیکھ کر آدمی مرعوب

ہوجاتا ہے افسری شاید کچھ اسی قسم کی عورت تھی وہ جس مکان میں رہتی تھی وہ کچھ اس زاویے سے واقع تھا کہ کمرے کی کھڑکی سبطین کی بیٹھک کے عین سامنے کھلتی تھی۔ یوں سبطین کے پاس بیٹھنے والے سارے مرد اس کی نگاہوں کی زد میں رہتے تھے لیکن وہ تو کبھی کسی کو خاطر ہی میں نہیں لائی اور سبطین سے جب دو تین مرتبہ اس کی نگاہیں چار ہوئیں تو خود سبطین ہی کی نگاہیں جھک گئیں اس نے نہ تو شرما کر منہ چھپایا اور نہ نگاہ بازی کی۔ فیاض خاں دلی جاتے ہوئے اگرچہ وہاں صرف ایک رات ٹھہرا تھا۔ لیکن افسری کی نگاہ سے وہ بھی نہ بچ سکا۔ افسری ہر ایک کا جائزہ ضرور لے لیتی تھی' اثر لے یا نہ لے۔ یہ پتہ نہیں کہ اس نے فیاض خاں کا صرف جائزہ لینے پر قناعت کی تھی یا کچھ اثر بھی لیا تھا۔ وہ تھی بھی تو اتنی گہری کہ آسانی سے چغلی نہیں کھاتی تھی شوہر سے اس کے کیسے تعلقات تھے' یہ تو شاید محلہ میں صحیح طور پر کسی کو بھی پتہ نہیں تھا۔ البتہ یہ سب جانتے تھے کہ اس کا شوہر ادھیڑ عمر کا آدمی ہے اور اس پر آشوب زمانے میں جب کہ ڈاڑھی والوں پر اپنی ڈاڑھیاں بار ہو رہی تھیں اس نے ڈاڑھی چھوڑ دی تھی۔ اور یہ کہ اس کے دن میں بارہ گھنٹے باہر صرف ہوتے تھے۔ کاروبار میں مصروف رہتا ہے یا واہی تواہی پھرتا ہے' اس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ کہنے والے یہ بھی کہتے تھے کہ میاں بیوی میں پٹتی نہیں ہے۔ البتہ اتنا تو ظاہر تھا کہ وہ شوہر کا احترام مطلق نہیں کرتی تھی وہ تو شاید اس کے وجود ہی کو نہیں گردانتی تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ سوائے اپنے کس کے وجود کو گردانتی تھی۔ گلشن کی رائے اس کے بارے میں سو فیصدی درست تھی۔ وہ صرف نک چڑھی ہی نہیں تھی اکل کھری بھی تھی اس کی شکایت محلہ کی ہر بی بی کو تھی۔ مگر اس نے بھی اس کان سنا اور اس کان اڑایا البتہ بوجی کا وہ تھوڑا بہت احترام ضرور کرتی تھی۔ اول تو بوجی غریب تھیں اللہ میاں کی گائے۔ پھر یہ کہ جب پاس پڑوس ہوتا ہے تو کچھ نہ کچھ راہ ورسم ہو ہی جاتی ہے۔ شاید اور کہیں سے بلاوا آتا تو افسری اسے خاطر میں نہ لاتی۔ لیکن بوجی کے یہاں وہ عین وقت پر پہنچی۔

گلشن نے یہی کہا تھا کہ مغرب کے فوراً بعد مجلس شروع ہوجائے گی۔ افسری مغرب کے فوراً بعد تو نہیں لیکن تھوڑی دیر بعد ضرور پہنچ گئی تھی۔ لیکن مجلس کے وہاں ابھی کوئی آثار نہ تھے۔ البتہ چند ایک بیبیاں بہت زور شور سے گفتگو میں مصروف تھیں۔ افسری نے انہیں بڑے لیے دیئے پن کے ساتھ سلام کیا۔ نمبردارنی کو اس کی یہ روش مطلق نہ بھائی۔ وہ ہر نوجوان عورت سے یہ توقع رکھتی تھیں کہ وہ انہیں دیکھ کر بچھ بچھ جائے گی۔ بوجی کے مطالبات مختصر تھے۔ انہوں نے اس لیے دیئے سے سلام کو بھی غنیمت سمجھا۔ پھر انہیں میزبانی کا فرض بھی تو ادا کرنا تھا۔ بولیں۔ ''اے فروا چھی تو ہے۔ بی بی تو مانس گند ہوگئی۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے۔ مگر کیا مجال کہ کبھی صورت دکھادے۔''

''بوجی کیا بتاؤں۔ کئی دفعہ ارادہ کیا کہ آپ کے پاس آؤں مگر پھر فرصت ہی نہ ملی۔''

''اے جا رہنے بھی دے۔ فرصت کو تجھے کونسا کام پھٹ پڑا۔ بال نہ بچے بیٹی تو ہم سے ملنا ہی نہ چاہتی ورنہ ڈوبا ایسا کیا تھا کہ وقت ہی نہ ملتا۔''

نمبردارنی شاید موقعہ کی تاک میں تھیں۔ فوراً شروع ہوگئیں۔ ''اے نگوڑا آج کل کا زمانہ ہی ایسا ہے۔ اب وہ اگلے زمانے کی محبتیں کہاں ہیں۔ اے بوجی تم نے تو ہماری بوا کو دیکھا تھا۔ کیسی ملنسار طبیعت کی تھیں۔ کسی کی ایسی ویسی خبر سن لیتی تھیں تو تڑپ جاتی تھیں۔ فوراً دیکھنے کو جاتی تھیں۔ مگر آج کل کی لونڈیوں کی آنکھ میں مروت نہ دل میں محبت۔ خون سفید ہوگیا کسی کا دم چلنے لگے تو یہ منہ میں پانی بھی نہ ڈالیں۔''

یہ تقریر کرتے ہوئے نمبردارنی غالباً یہ بھول گئی تھیں کہ ان کے پاس ہی ان کی بیٹی فرحت بیٹھی ہے جو اپنی کالجیت کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری سمجھتی تھی کہ ماں کو اپنے کمرے میں باریاب ہونے دے۔ مجلس سے تو اسے کیا دلچسپی تھی۔ مگر کبھی کبھی وہ یہ ثابت کرنے پر بھی تو مائل ہو جاتی تھی کہ ایک کالج کی روشن خیال لڑکی بھی دقیانوسی رسموں کو برداشت کر سکتی ہے۔

لیکن بلو نے نمبردارنی کو اچھا جواب دیا۔ ''اے چلو رہنے بھی دو۔ آجکل تو بس دور ہی بھلے ہیں۔ نہ ملیں گے نہ جوتیوں میں دال بٹے گی۔ مٹے ایسے ملنے پہ خاک۔''

بوجی کو بلو کا یہ قنوطی انداز پسند آیا۔ کہنے لگیں۔ ''اری بلو یہ تو تیری خواہ مخواہ کی بات ہے۔ بھئی برتن جب ملیں گے تو کھنکیں گے بھی۔ ایسا کونسا گھر ہے جس میں بات نہیں نکلتی چوہوں سے کان تو کٹائے نہیں ہیں کہ بات ہی نہ کریں۔''

''مگر بوجی بات کا بھی تو طریقہ ہووے ہے۔ آج کل کے لوگ کٹے مرے ہیں۔''

''اے رہنے بھی دے کیا کٹے مرے ہیں۔''

بلو اگر ذرا دیر کر دیتی تو بوجی نے مورچہ فتح کر ہی لیا تھا۔ لیکن اس نے فوراً پینترا بدلا۔ اور سیاست کے میدان میں جا پہنچی۔

''اوئی بوجی تم تو آنکھوں دیکھتے مکھی نگلو ہو۔ دیکھتی ہو نا کیا آفت نافت اٹھ رئی اے۔ سارا ملک تراہ تراہ بول گیا۔''

اس آفت نافت کی توجیہہ نمبردارنی نے کی۔ ''اجی میں تو جانوں کسی نے اس ملک میں سیہہ کا کانٹا گاڑ دیا ہے۔''

بلو تنک کر بولی۔ ''اجی گاڑنے کو کیا جنید خاں آئے تھے۔ یہی کلوا فرنگی ہے بس کی گانٹھ۔''

فرنگی کے لفظ پہ بوجی کو فوراً غدر یاد آ گیا ''اے ہے ان کمبختی مارے گوروں نے تو غدر میں بھی بہتیری آفت بوئی تھی۔ موئے جنیں کب یاں سے دفان ہوں گے۔''

فرحت اس بحث میں شریک ہونا اپنے شایان شان نہیں سمجھتی تھی۔لیکن بوجی کو بے خبری کو دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔آخر بول ہی پڑیں۔''بوجی آپ کونسی دنیا میں رہتی ہیں۔انگریزوں کی حکومت تو ختم بھی ہو چکی۔ہندوستان اور پاکستان کو آزادی مل گئی ہے۔''

آزادی کے لفظ پر نمبردارنی بہت بپھریں۔''آزادی۔آزادی۔اس لچی حرامزادی آزادی کی تو ناک چوٹی کاٹ کے جوتیں مار مار کے باہر دھکے دے دیئے جائیں۔چھنال نے آتے ہی خون خچر کرا دیئے۔''

خون خچر کا لفظ سن کر نوابن کے جسم میں تھرتھری پیدا ہوگئی۔دہشت زدہ آواز میں بولی۔''ارے بھئی بڑی قیامت اٹھ رئی اے۔پنجاب میں تو نو نیزے پانی چڑھ را ہے۔اور سنیں ہیں کہ دلی میں بھی۔''

دلی کے متعلق بلو کو کافی معلومات تھیں۔اس سے ضبط نہ ہو سکا۔بات کاٹتے ہوئے بولی۔''اے سنیں کیا۔ڈاخ خانے میں تو گھڑی گھڑی کی خبر آرائی اے۔وہ کہہ رئے تھے کہ دلی مسلمانوں کی لاشوں سے پٹی پڑی ہے۔''

یہ فقرے سن کر بوجی کا سارا جسم کانپ اٹھا۔نمبردارنی نے خاک اثر نہ لیا۔چمک کر بولیں۔''اجی پنجابی تو ہمیشہ کے لڑاکے تھے مگر موئے دلی والوں کو لڑنے کی کیا ہڑک اٹھی ہے۔''

نوابن نے اس کا فوراً جواب دیا۔''اجی نمبردارنی یہ مت کہو۔دلی والے بھی مرچ ہیں مرچ۔ڈوبا گاندھی اتنے دن سے واں پڑا تھا۔لوگوں کی ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال ڈال دیئے مگر کوئی مانا ہی نہیں۔''

نمبردارنی بے ساختہ بولیں۔''اے آندھی گاندھی۔مٹا لولا پنگا۔چاند گرہن کی پیدائش۔وہ کیا ملاپ کرائے گا۔اس نے تو خاک سی چیز نمک پہ وہ فیل مچائے کہ ساری دنیا ہل گئی۔''

بلو کے سینے میں ابھی اور راز بھی پوشیدہ تھے اور بحث کسی اور طرف نکلی جا رہی تھی نمبردارنی کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔''میرے تو سن سن کے ہوش اڑے جا رئے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ حسن پور میں بھی جو ہو جائے وہ تھوڑا ہے۔''

حسن پور کا ذکر آتے ہی ایک دم سے ساری بیبیوں کے چہروں کی کیفیت بدل گئی۔بوجی کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آنے لگے۔پھر بھی انہوں نے اپنی تسکین کا کچھ نہ کچھ انتظام کیا۔''بی بی جب غدر پڑا تھا تو سارا ملک تراہ ترہ بول گیا۔مگر حسن پور کو اللہ نے اپنی امان میں رکھا۔ہندو مسلمان ایک ہو گئے یہ جو ہمارے سامنے والا پیپل ہے نئیں اس پہ ایک آدمی ڈھول لے کے بیٹھ گیا تھا۔جب گوجر چڑھ کے آئے تو اس نے ڈھول بجا دیا۔سب کے سب لٹھیں بلم لے کے نکل آئے۔گوجر یہ دیکھ کے باہر سے باہر ہی چلے گئے۔''

فرحت کو یہاں پھر مجبوراً بولنا پڑا۔ بوجی یہ غدر نہیں ہے۔ یہ تو ہندو مسلمانوں کا فساد ہے۔''

بلو بولی۔ ''اجی بوجی وہ تو کہہ رئے تھے کہ دلی کے بعد حسن پور ہی کا نمبر ہے۔''

یہ فقرہ سن کر تو واقعی بوجی کے ہوش اڑ گئے مگر اس موقعہ پر افسری نے بڑا کام کیا۔ اب تک وہ بڑے صبر سے باتیں سنتی رہی تھی لیکن اب اسے مجبور ہو کر بوجی کو یہ یاد دہانی کرانی ہی پڑی کہ مجلس اب شروع ہو جانی چاہیے۔ بوجی نے فوراً گلشن کو کھنکھٹایا۔ گلشن نے جھٹ پٹ اپنے فرائض انجام دیئے۔ پھر انہوں نے بلو سے کہا کہ ''بی بی مجلس شروع کر دو۔'' اور بلو شہادت نامہ کھول کر بیٹھ گئی۔

نمبردارنی روتی کم تھیں' شور زیادہ مچاتی تھیں۔ لیکن بوجی شور نہیں مچا سکتی تھیں۔ وہ صرف روتی تھیں اور بڑے خلوص اور یکسوئی سے روتی تھیں اور آج تو ان پر کچھ بہت ہی زیادہ رقت طاری تھی۔ اور میں واقعات کربلا کے ساتھ ساتھ بلو کی درد بھری آواز کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔ پھر جب اس نے امام حسین کے بچپن کے واقعہ سے واقعہ کربلا کی طرف گریز کیا تو اس کی آواز میں اور رقت پیدا ہو گئی۔ ''کیوں حضرات سنا آپ نے کہ جس کے رونے سے فرشتہ ہائے آسمان گریاں ہوئے حیف صد حیف کہ اسی فرزند رسول کے ساتھ امت بے دین نے کیا کیا ظلم کئے۔ صحرائے کربلا میں پانی بند کیا اور تین روز کا بھوکا پیاسا زمین پر مثل گوسفند قربانی کے ذبح کیا اور سر انور کو امام مظلوم کے نوک نیزہ طویل پر بلند کیا اور بستی بستی اور شہر شہر تشہیر کیا۔

در یگانہ دریائے مجمع البحرین ..... بخوں طپیدہ کرب و بلا امام حسین

صاحب روضۃ الشہدا نے لکھا ہے کہ امام ہمام جب بعد زوال زمین پر تشریف لائے تو شمر خنجر بکف سینہ بے کینہ امام پر چڑھا اور اس بے ادبی کا مرتکب ہوا کہ زمین کربلا لرز گئی۔ حمید کہ اس وقت میدان کربلا میں موجود تھا کہتا ہے کہ بعد شہادت زمین کو زلزلہ آیا اور آسمان سے خون برسا اور ایک سیاہ آندھی اٹھی اور آفتاب کو گہن لگا اور منادی نے ندا کی کہ ''قتل الحسین بکربلا ذبح الحسین بکربلا۔'' راویوں نے یوں بھی لکھا ہے کہ اس رات چاند کو گہن لگا۔ سارا چاند گہنا گیا اور رات بھر ایک بی بی کے نوحے کی آواز آتی رہی جو کبھی مشرق سے بلند ہوتی تھی اور کبھی مغرب سے آتی تھی اور کبھی ساری فضا میں پھیل جاتی تھی۔'' نمبردارنی رو تو بہت دیر سے رہی تھیں لیکن اب ان کے آنسو بھی نکلنے شروع ہو گئے تھے بلکہ اس وقت تو افسری کی آنکھیں بھی نم ہو چلی تھیں مگر شاید وہ رقیق القلبی کے کسی بڑے مظاہرے پر آمادہ نہ تھی۔ البتہ بوجی زار و قطار رو رہی تھیں۔ ان کے دوپٹے کا ایک کونہ آنسوؤں سے تر بتر ہو گیا تھا اور بلو اسی درد و سوز کے ساتھ پڑھے جا رہی تھی۔ منقول ہے کہ اس رات مدینے میں درمیان زمین و آسمان رونے کی صدائیں سنی گئیں و ایک فرشتہ ندا دیتا تھا کہ بخدا مسمار ہوئے ارکان دین کے' اور تاریک ہوئے ستارہائے' علم نبوت کے' اور مٹ گئے۔ نشان پرہیزگاری کے۔ اے اہل

یثرب یہ شہر قابل بود و باش کے نہیں رہا۔ آگاہ ہو کہ شہر مدینہ کی رونق جاتی رہی اس لیے کہ مزار نبی کا مجاور اور تمہارا سردار اور جنت کا شہزادہ اور ساقی کوثر کا نورعین تین دن کا بھوکا پیاسا کربلا کی ریتی پہ ذبح کیا گیا۔ مومنین ادھر تو یہ حال تھا اور ادھر کربلا میں ایک بی بی یوں نوحہ کر رہی تھی۔

زہرا کی عمر بھر کی کمائی کو کیا ہوا
بتلا دے اے زمین مرے بھائی کو کیا ہوا

نمبردارنی کا گلا اور آنکھیں دونوں کام کر رہی تھیں۔ بوجی کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ نوابن بھی حسب مقدور رو رہی تھی۔ بلو کی آواز تھم گئی تھی اور رونے کا سلسلہ جاری تھا۔ آخر گلشن سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے اپنی نقل و حرکت سے گویا اس کا اعلان کیا کہ بس کرو۔ مجلس بہت دیر ہوئی ختم ہو چکی تھی لیکن مجلس کی فضا کچھ ایسی جمی تھی کہ سنجیدگی کا طلسم ٹوٹنے کو ہی نہ کہتا تھا۔ دیکھا تو یہ گیا ہے کہ کیسی ہی رقت کی مجلس ہوا۔ ادھر مجلس ختم ہوئی ادھر باتوں کی گرما گرمی شروع ہوئی۔ دراصل مجلس کی ایک بڑی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کی بدولت مل بیٹھنے اور چٹخارے دار باتیں کرنے کا موقعہ میسر آ جاتا ہے۔ اگر مجلسیں کہیں محض غم حسین تک محدود رہا کرتیں تو پھر امام حسین کی شہادت سے بھی کڑی آزمائش بن جاتیں اور محرم میں جینا اجیرن ہو جاتا۔ لیکن یہ مجلس عجب تھی۔ حزن اور خاموشی نے ایسا جادو پھیلایا تھا کہ کسی کو بولنے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ نمبردارنی جب اچھی طرح آنسو پونچھ چکیں اور تبرک ان کی گود میں آ پڑا تو انہوں نے ایک دو نیم گرم فقرے کہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نیم گرم مقرے محض تمہید تھے مگر انہوں نے خاطر خواہ اثر نہیں کیا۔ نمبردارنی کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور انہوں نے دوبارہ اس قسم کے اقدام کی ہمت نہیں کی۔ البتہ گلشن کی بات کا نوٹس ضرور لیا گیا۔ لیکن اس سنجیدگی کی فضا ٹوٹی تو نہیں اور شدید ہو گئی۔ نمبردارنی کو سوجھ بوجھ پر اسے شاید زیادہ اعتبار تھا۔ اسی لیے اس نے مخصوص طور پر نمبردارنی کو مخاطب کیا۔ ''نمبردارنی صاب۔ سنیں ہیں کہ اس جمعرات کو چاند گرہن پڑے گا۔''

''چاند گرہن۔'' بوجی کے منہ سے صرف اسی قدر نکل سکا۔

سب بیبیاں خاموش تھیں۔

آخر نمبردارنی بولیں۔ ''اری کون کہتا تھا؟''

''اجی وے رفیا کیوے تھا۔ کیوے تھا کہ آدھا چاند ڈوب جاوے گا۔''

''اللہ رحم کرے۔'' نوابن ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''بڑا سخت گرہن ہے۔''

پھر خاموشی چھا گئی۔

نمبردارنی بلو کے بڑھے ہوئے پیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''بی بی ذرا احتیاط رکھیو۔''

بلو چپ چاپ بیٹھی رہی۔

بوجی نہ معلوم کن خیالات میں گم تھیں۔ ایکا ایکی بولیں گویا خود اپنے آپ سے کہہ رہی ہیں۔ ''اللہ ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ ہماری خالہ بی کہا کرے تھیں کہ غدر کے دنوں میں ایسا گہن پڑا تھا کہ سارا چاند ڈوب گیا تھا۔''

خاموشی اور شدید ہوگئی۔ نمبردارنی نے خواہ مخواہ چھالیاں کترنی شروع کر دی تھیں سب خاموش تھیں۔ صرف سروطے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سب کے چہروں پر ایک سنجیدگی' ایک ہراس کی کیفیت طاری تھی۔ افسری چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کی کیفیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس کی شربتی آنکھوں کی گمبھیرتا کسی فوری واقعہ کا اثر نہیں تھی۔ وہ تو ایک مستقل کیفیت تھی۔ شاید اس نے اس خبر کا اثر ایسی زیادہ شدت سے قبول بھی نہیں کیا تھا۔ ایکا ایکی وہ جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔ اس کے اٹھتے ہی دوسری بیبیاں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بوجی نے چلتے چلتے افسری کو مخاطب کیا۔ ''بیٹی احتیاط رکھیو ذرا خدا ہر بلا سے بچائے رکھے۔ بلکہ میرے ہی گھر آ جائیو۔''

افسری نے بہت خاموشی سے یہ فقرہ سنا اور برقعہ پہن اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

سبطین کی مخالفت کے باوجود نماز پڑھنے اور کلمہ پڑھانے کے تحریک جاری ہی اور نماز پڑھنے اور کلمہ پڑھانے کی تحریک کے باوجود حسن پور میں خوف و ہراس پھیلتا رہا۔ حسن پور کی آبادی کا طور یہ تھا کہ پورے محلے یا تو نرے ہندوؤں کے تھے یا نرے مسلمانوں کے تھے۔ حسن پور کی ناک ڈپٹی صاحب تھے اور ڈپٹی صاحب کا مکان اوپر کوٹ میں تھا۔ ڈپٹی صاحب برسوں ہوئے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ لیکن اوپر کوٹ کی دہاک اب تک قائم تھی۔ آخر حسن پور والے کالے خاں کا لوہا بھی تو مانتے ہی تھے۔ پھر شیر و پلہ دار بھی کچھ نہ کچھ حیثیت ضرور رکھتا تھا۔ مٹھو اخود علن کی دوکان پر آگے بیٹھتا تھا اور ڈپٹی صاحب مر گئے تھے تو کیا ہوا تھا۔ لالہ رگھویر دیال بزاز اور دوسرے رئیس عید بقرعید پر تو سبطین کے پاس آ ہی جاتے تھے۔ وضعداریاں تو اب چند مہینوں سے ختم ہوئی تھیں۔ اس کے بعد چکرالٹا گھوما اور حق صاحب اور نمبردار صاحب نے ضرورت بے ضرورت لالہ رگھویر دیال بزاز کی دوکان پر پہنچ کر اپنی غیر فرقہ پرستانہ ذہنیت کا ڈھول پیٹنا شروع کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ فضا اور مکدر ہوئی اور اوپر کوٹ ایک بند قلعہ بن کر رہ گیا۔ یوں حق صاحب اور نمبردار صاحب لالہ رگھویر دیال کی زیارت سے محروم ہوگئے۔ سنتے ہیں کہ وقت بدلتے بدلتے بدلتا ہے۔ مگر حسن پور میں تو

وقت آناً فاناً بدلا۔ ساری وضعداریاں یکا یک بالائے طاق رکھ دی گئیں۔ میل ملاپ ختم۔ لین دین بند۔ شبہ اور نفرت نے زور باندھا۔ مغربی پنجاب سے آنے والے شرنارتھی۔ حسن پور کے لیے دو تحفے لائے تھے۔ نفرت کا جذبہ اور انتقام کا جوش یہ دونوں چیزیں ساری فضا پر چھا گئیں' طبیعتوں میں رچ گئیں۔ پہلے ان کا خاموش مظاہرہ ہوا۔ اس خاموش مظاہرے کی ابتدا بالکل غیر محسوس طور پر ہوئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ ساری فضا میں ایک اینٹھن کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ وقت کی رفتار کبھی آہستہ ہوئی کبھی تیز۔ کبھی تو یوں معلوم ہوتا کہ حسن پور والے بکٹ گھوڑوں پر سوار ہیں اور یہ گھوڑے ایک اتھاہ کھائی میں اترے چلے جا رہے ہیں اور کبھی یوں محسوس ہوتا کہ وقت کا جلوس تھم گیا ہے' جم کر کھڑا ہو گیا ہے۔ دنوں میں ایک سراسیمگی کی کیفیت ہوتی اور راتوں پر ایک سکتہ طاری رہتا۔ رات شروع تو ہو جاتی تھی مگر ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ بس یوں لگتا کہ تاریکی فضا میں رس بس گئی ہے۔ وقت چلتے چلتے رک گیا ہے اور اب حسن پور میں دن کبھی نہیں نکلے گا۔ دن نکلنے کی ساری توقعات ختم ہو جاتیں اور نکل آتا مگر ہر قسم کے دھوم دھڑکے کے بغیر۔ حسن پور کے باغوں کی چڑیاں آخر کہاں ہجرت کر گئی تھیں اور کس احساس کے ماتحت ہجرت کر گئی تھیں؟ کیا واقعی چڑیوں کا وجدان اتنا تیز ہوتا ہے کہ وہ فضا کو سونگھ کر آنے والے وقت کی بو باس معلوم کر لیتی ہیں؟ کچھ بھی بہر حال صبح نہایت خاموشی سے نمودار ہوتی۔ کہیں بہت دور سے مرغ کی اذان تیرتی ہوئی آتی۔ پھر فضا کے سناٹے میں اذان کی کانپتی ہوئی آوازیں بلند ہوتیں اور خاموشی میں ڈوب جاتیں دور کے کسی مندر سے گھنٹہ بجنے کے مسلسل آوازیں آتیں اور پھر خاموش ہو جاتیں۔ اجالا ہوتا جاتا اور حسن پور کی خاموش گلیاں بدستور خاموش رہتیں۔ پھر دن نکل آتا اور بڑی آہستگی سے کسی کنڈی کے کھلنے کی آواز آتی۔ اس کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا دروازہ کھلتا اور گلیوں میں قدموں کی دبی دبی چاپ سنائی دیتی۔ دن چڑھنے لگتا اور دن کے چڑھنے پر یہ راز کھلتا کہ دن نہیں نکلا ہے بلکہ رات ہی نے ایک نیا سوانگ رچایا ہے۔ رات کا سوانگ جاری رہتا اور گلیوں اور سڑکوں پر بازاروں اور منڈیوں میں خاک اڑتی رہتی۔ اکا دکا راہگیر نظر آتا اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا۔ گاہک چپ چاپ دوکانوں پر نمودار ہوتے' آہستہ سے سودا مانگتے اور سودا سنبھال خاموشی سے واپس چلے جاتے گپ بازی کا دستور اٹھ گیا۔ دوکانوں کے پڑوں پر بیٹھنے اور فقرہ بازیاں کرنے کا روزج ختم ہو گیا۔ قہقہے' گالیاں' آوازے۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ بس ایک اضمحلال کی کیفیت باقی رہ گئی۔ ہر بازار میں کھڑے ہو کر یہ گمان گزرتا کہ شہر میں کسی جنازے کا جلوس گشت کر رہا ہے۔ اور اب وہ ادھر سے گزرنے والا ہے۔ جنازے کا جلوس دن بھر گشت کرتا رہتا۔ پھر شام ہوتی۔ دونوں وقت رواروی میں ملتے اور جدا ہو جاتے۔ قدموں کی چاپ یکا یک تیز ہو جاتی۔ لوگ عجلت میں بازاروں سے لوٹتے اور گلیوں میں داخل ہونے لگتے۔ لوگ گلیوں میں داخل ہونے لگتے اور دروازوں کے دھاڑ دھاڑ بند

ہونے کی آوازیں آتیں۔ مکانوں کے دروازے بند ہوتے چلے جاتے اور رفتہ رفتہ رات کا سناٹا پھر پوری بستی کو آدبوچتا۔

دن گزرتے گئے اور یہ غیر معمولی کیفیت معمول بن کر رہ گئی۔ ہراس زندگی کا جز بن گیا۔ افسردگی فضا کی نس نس میں رچ گئی۔ مغربی پنجاب سے شرنارتھیوں کی آمد کا تانتا بندھا رہا۔ پھر دلی کے فساد کی خبریں آنی شروع ہوئیں۔ یہ خبریں زیادہ ہولناک' زیادہ دہشت خیز ہوتی گئیں۔ فضا میں اینٹھن کی کیفیت اور زیادہ شدید ہوگئی اور بال آخر ایک روز مادہ پھٹ پڑا جھٹپٹے کا وقت تھا۔ مسجد میں اذان ہورہی تھی۔ اس وقت ایک سایہ ہلتا کانپتا اوپر کوٹ میں داخل ہوا۔ علن لالٹین جلا چکا تھا۔ آج اس کی دوکان پر غیر معمولی خاموشی ہوئی تھی۔ اکیلا کالے خاں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اورتو اور رفیا بھی اس وقت موجود نہیں تھا۔ اتنے میں علن چونک کر بولا۔ ''ابے یار کالے خاں دیکھیو بے یہ کون سالا شرابیوں کی طریوں سے جھومتا ہوا آریا اے۔''

کالے خاں نہ معلوم کس خیال میں گم تھا اور کس طرف اس کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ بولا۔ ''آنے دے بے۔ ہوگا کوئی ساپلہ دار تاڑی پی کے آریا ہوگا۔''

اتنے میں سایہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ علن اور کالے خاں دونوں لپک کر پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ افسری کا شوہر رشید گرا پڑا ہے۔ پھٹا ہوا۔ کپڑے خون میں شرابور انہوں نے جلدی جلدی اٹھایا اور اسے گھر پہنچایا۔ رشید لب دم تھا۔ گھر پہنچتے ہی پٹ سے دم دے دیا۔ اوپر کوٹ میں خبر آگ کی طرح پھیلی۔ جس نے سنا لپکا ہوا افسری کے گھر پہنچا۔ سارے محلہ میں تہلکہ پڑ گیا۔ جس مرد نے سنا اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جس عورت نے سنا اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

اوپر کوٹ پر ہی کیا پورے حسن پور پر وہ رات بہت سخت گزری۔ کالے خاں رفیا اور علن کا گلیوں میں پہرا لگا۔ انہوں نے رات میں کئی مرتبہ آگ بجھانے کے انجن کی آواز سنی۔ سبطین نے جو بھری بندوق کاندھے پر رکھے رات بھر اپنے کوٹھے پر بیٹھا رہا تھا۔ بار بار مختلف محلوں سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھے۔

دلی

۶ ستمبر

فضا کی اینٹھن ختم ہوئی۔ مگر عجب انداز سے۔ کوئی موہوم فتنہ عجب انداز سے بپا ہونے کا بہانہ ٹٹول رہا تھا۔ فتنہ کو بپا ہونے کا بہانہ مل ہی جاتا ہے۔ یہ دور اعصاب کی آزمائش کا دور ہے۔ خاموشی بھی اعصاب کو آزماتی ہے۔ ہنگامہ بھی اعصاب کو آزماتا ہے۔ وقت کا دستور یہ ہے کہ پہلے خاموشی چھا جاتی ہے اور اس خاموشی میں اتنی شدت اور ایسا ڈراؤنا پن ہوتا ہے کہ اعصاب چٹخنے لگتے ہیں۔ دم گھٹنے

لگتا ہے۔ پھر اچانک خاموشی ٹوٹتی ہے اور ایسی قیامت اٹھتی ہے کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ہیں اور ذہن کی رگیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔

۷ ستمبر

فساد شروع ہوا اور آگ کی طرح پھیل گیا۔ ہر محلہ پر یورش ہے اور ہر بستی پر حملہ کی تیاریاں ہیں۔ رات ایسا شور ہوا کہ خدا کی پناہ۔ یہ خوفناک شور خود آدمی کو پاگل کر دینے کو بہت کافی تھا۔ فائر انجنوں کے دوڑنے کی آوزیں بھی رات بھر آتی رہیں۔ ان آوازوں کو سن کر یوں احساس ہوتا تھا کہ ساری دلی شعلوں میں جھونک دی گئی ہے۔

اس فساد کی نوعیت میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کبھی تو میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ معمولی فساد ہے اور دو چار دن میں پولیس اس پر قابو پالے گی۔ مگر بار بار میرا دل ایک نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ کوئی معمولی فساد نہیں ہے۔ یہ کوئی بڑی قیامت ہے ۵۷ء کی قیامت سے بڑی قیامت۔

۸ ستمبر

سارے محلہ میں خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے ہر چہرے پر ہوائیاں اڑتی نظر آتی ہیں جو خبریں یہاں پہنچ رہی ہیں وہ واقعی بڑی خوفناک ہیں۔ ان کا اثر یہی ہونا چاہیے جو ہو رہا ہے مگر میں حیران ہوں کہ اس زمانے میں جب یہاں نہ کوئی آتا ہے نہ یہاں سے کوئی جاتا ہے۔ یہ پل پل کی خبریں یہاں کیسے پہنچتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انہیں خبریں ہی کہوں یا افواہیں کہوں۔ ممکن ہے ان کی اصلیت کچھ نہ ہو۔ محض خوفزدہ تخیل کی ایجادیں ہوں۔ مگر اس زمانے میں واقعہ اور افواہ میں امتیاز کرنا بھی کچھ بے معنی ہی سی بات ہے۔ معمولات کی دنیا میں افواہیں بڑی مبالغہ آمیز ہوتی ہیں لیکن جب معمولات کا نظام درہم برہم ہو جائے تو واقعات اتنے مبالغہ آمیز پیمانے پر رونما ہوتے ہیں کہ غریب افواہوں کی ان کے سامنے کوئی بساط ہی نہیں رہتی یہ زمانہ وہ ہے کہ حقیقتیں افواہیں بن گئی ہیں اور افواہیں حقیقتیں۔ ایک خوفناک واقعہ ہوتا ہے اور اس کی خبر دم کے دم میں یوں پھیلتی ہے گویا یہ کوئی افواہ تھی جسے پھیلنے کے لیے کسی ٹھوس مادی ذریعہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دلی شہر بہت سی الگ الگ دنیاؤں میں بٹ گیا ہے۔ ہر محلہ ایک الگ دنیا ہے جس کا باقی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہے مگر شہر کے کونے میں بھی جو کوئی واردات ہوتی ہے اور فضا کی لہریں اسے سارے شہر میں پھیلا دیتی ہیں۔

۹ ستمبر کی رات

دن کے متعلق آخر کیا لکھوں۔ دن ہے کہاں۔ دلی میں جب دن نکلے گا دیکھا جائے گا اب تو رات کا تسلط ہے۔ ایک خوفناک ہنگامہ خیز رات ہے۔ جس نے پوری دلی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ رات محلہ کے ہر شخص کو یقین تھا۔ کہ حملہ ہوگا۔ مگر حملہ نہیں ہوا۔